اقامتِ دین اور عملی تقاضے

ڈاکٹر انیس احمد

یہ بات کسی تعارف کی محتاج نہیں کہ عالمی تحریکات اسلامی کی دعوت کا بنیادی مقصد اقامتِ دین کے ذریعے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضا کا حصول ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جو تحریکات اسلامی کو دیگر تنظیموں سے ممتاز کرتا ہے۔ بعض دعوتی تنظیمیں اپنی زیادہ توجہ عبادات پر دیتی ہیں۔ چنانچہ ان کی نگاہ میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کا صحیح طور پر ادا کرنا دین داری کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ ان تنظیموں سے وابستہ افراد اسی غرض سے دُور دراز کے سفر کرتے ہیں کہ لوگوں کو عبادات کے فضائل سمجھائیں اور بالخصوص نماز کے فرائض اور واجبات سے آگاہ کریں۔ ان کی یہ خدمات قابلِ قدر اور دین کی اقامت کی کوشش کا ایک اہم ابتدائی حصہ ہیں۔ لیکن کیا اقامتِ دین کی جدوجہد کی ابتدا اور انتہا بس یہی ہے؟

قرآنِ پاک کی تعلیمات اور اسوۂ رسولؐ کی روشنی میں اس پہلو کا سمجھنا بہت ضروری ہے۔ خصوصیت سے موجودہ عالمی حالات اور اسلام کے باب میں مغربی اور خود مسلم دنیا میں مغربی فکر کے زیراثر سوچنے والے دانش وروں اور نشری اداروں کے اسلام میں دین و دنیا اور مذہب و ریاست کے تعلق کے بارے میں فکری اور سیاسی یلغار کی روشنی میں کچھ عناصر اپنی سادگی میں اور کچھ دوسرے مقاصد سے دین کو مسجد، مدرسہ اور گھر کے دائرے میں محدود کرنے کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان کا ہدف اسلام کا وہ تصور ہے جو زندگی کی تمام وسعتوں پر حاوی ہے۔ کچھ عناصر کوشش کرتے ہیں کہ تحریکاتِ اسلامی کے تصور 'اقامتِ دین' کی اصطلاح کو دین کی سیاسی تعبیر قرار دے کر اس سے اپنی براءت کا اظہار کریں۔ کچھ اخلاص سے دین کو ایک محدود دائرے میں محصور کر رہے

اور دوسرے پوری ہوشیاری کے ساتھ دین کو اجتماعی زندگی سے خارج کرنا چاہتے ہیں۔

فریضہ اقامتِ دین

تحریکاتِ اسلامی 'اقامتِ دین' کی اصطلاح کے استعمال پر اس لیے اصرار کرتی ہیں کہ ان کے خیال میں اسلام ایک جامع دین ہے اور دین کی جامعیت اس کے معاشرتی، معاشی، قانونی، ثقافتی اور سیاسی کردار کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتی۔

اسلام اور عیسائیت میں ایک نمایاں فرق یہی ہے کہ عیسائیت زندگی کو دو خانوں میں تقسیم کرتی ہے۔ ایک کا تعلق حضرت عیسیٰ علیہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات و عمل سے ہے اور دوسرے کا تعلق دنیاوی شان و شوکت اور معاشی اور سیاسی معاملات سے۔ چنانچہ ایک دین دار عیسائی کا مطلب یہی لیا جاتا ہے کہ وہ باقاعدگی سے چرچ جاتا ہو اور اپنے پڑوسی کے ساتھ محبت سے پیش آئے، حضرت عیسیٰؑ کی طرح اگر ممکن ہو تو تجرد کی زندگی اختیار کرے اور آخر کار آپ علیہ اسلام کے اسوہ پر عمل کرتے ہوئے اپنے عقیدے کے تحفظ میں سولی پر چڑھ سکے تو یہ گویا اس کی مذہبی معراج ہوگی۔ اسلام کا مطلوبہ معیار اس سے بالکل مختلف وہ اسوۂ حسنہؐ ہے، جس میں مکہ مکرمہ میں پیش آنے والے امتحانات، ظلم و تشدد سے گزرنے کے بعد مدینہ منورہ میں اسلامی معاشرت، اسلامی معیشت، اسلامی ثقافت اور اسلامی طریق حکمرانی کی اعلیٰ ترین مثال آپؐ نے اپنے عمل سے پیش فرما کر دین کی تکمیل اور تفسیر فرمائی۔ اس طرح اپنے طرزِ عمل کی شکل میں زندگی کی اکائی کو غیر منقسم اور توحیدی بنا کر ایک قابلِ عمل نمونہ قیامت تک کے لیے پیش فرما دیا۔

تحریکاتِ اسلامی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی جامع تصور اسوۂ حسنہ کو اپنے لیے دین کی مستند تعبیر اور عملی مثال قرار دیتی ہیں۔ اس بنا پر ان کے کارکنان راتوں کی تنہائی میں اپنے ربّ کے حضور گڑگڑا کر مدد کی درخواست کرتے ہیں اور دن کی روشنی میں اسوۂ نبویؐ کی پیروی کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر اقامتِ صلوٰۃ، اقامتِ زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کی حفاظت اور ان کے نفاذ و قیام اور انسانی معاشرے میں عدل و انصاف کے قیام کو دین کا لازمی عنصر سمجھتے ہیں۔

سوال کیا جاتا ہے کہ 'اقامتِ دین کی اصطلاح کہاں سے آگئی؟ ہم نے بچپن سے

ارکانِ اسلام کے نام سے کلمۂ شہادت، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے بارے میں تو سنا ہے کہ یہ دین کے ارکان ہیں، یہ بھی سنا ہے کہ بعض فقہا جہاد کو چھٹا رکن کہتے ہیں لیکن یہ اقامتِ دین کا تصور کہاں سے آ گیا؟' نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسلام تو دیگر مذاہب کی طرح ایک مذہب ہے اور ظاہر ہے مذاہب عالم عموماً اپنے آپ کو انسان اور انسانوں کے خدا کے درمیان ایک روحانی رشتہ ہی سے تعبیر کرتے ہیں، جب کہ سیاسی اقتدار ایک مادی اور دنیاوی تصور ہے۔ اس لیے ان کے نزدیک سیاست اور مذہب دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

یہی وہ بنیادی فکری انتشار ہے جو آگے چل کر یہ بھی سمجھا تا ہے کہ نہ صرف مذہب اور سیاسی سرگرمی دو مختلف چیزیں ہیں بلکہ روحانیت اور للّٰہیت اور معاشرتی اور سیاسی سرگرمی دو متضاد چیزیں ہیں۔ اس لیے ایسے افراد کے نزدیک سچی مذہبیت اور روحانیت یہ ہو گی کہ انسان خاندانی جھمیلوں سے بچ کر رہے اور اپنے رب سے لو لگانے کے لیے کسی خانقاہ، کسی پہاڑی کے غار، کسی صحرا میں گوشہ نشین ہو کر اپنے آپ کو ہر طرف سے کاٹ کر اپنے رب کا 'ولی' بن جائے۔ انسانی فکر کے ان لامتناہی تصورات کا سلسلہ کسی ایک مقام پر جا کر نہیں رُکتا۔ سوال یہ ہے کہ پھر حق کیا ہے؟ کیا اسلام واقعی دیگر مذاہب کی طرح ایک مذہب ہے یا اس کی اپنی کوئی پہچان اور خصوصیت ہے؟

قرآن کریم کی زبان میں اسلام اپنے آپ کو مذہب کی جگہ دین قرار دیتا ہے، اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (اٰلعمرٰن ۳:۱۹)۔ اس کے ساتھ ہی اپنے بارے میں ایک حرکی تصور دیتا ہے کہ یہ انسان کو تاریکی سے نکال کر نور میں لے آتا ہے۔ اسی بنا پر ہم اسلام کو توحید کے قیام کی تحریک کہتے ہیں۔

اقامتِ دین کا مفہوم

اقامت کا لفظ جب کسی ٹھوس چیز کے لیے بولا جائے، اس کے معنی سیدھا کر دینے کے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں کہا گیا: یُّرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ فَاَقَامَہٗ ط (الکہف۱۸:۷۷) ''دیوار (ایک طرف جھک گئی تھی اور) گرا چاہتی تھی تو اسے سیدھا کر دیا''، اور جب معنوی اشیا کے لیے بولا جائے تو اس کا معنی، مفہوم کا پورا کا پورا حق ادا کر دینے کے لیے آتا ہے۔

امام راغب الاصفہانی اقامتہ الشئی کے معنی ''کسی چیز کا پورا پورا حق ادا کرنے کے''

بیان کرتے ہیں اور قرآن سے دو مثالیں وضاحت کے لیے پیش کرتے ہیں:

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰي شَيْءٍ حَتّٰي تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (المائدہ ۵:۶۸) صاف کہہ دو کہ ''اے اہل کتاب! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تورات اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمھاری طرف تمھارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہیں''۔ ضرور ہے کہ یہ فرمان جو تم پر نازل کیا گیا ہے ان میں سے اکثر کی سرکشی اور انکار کو اور زیادہ بڑھا دے گا، مگر انکار کرنے والوں کے حال پر کچھ افسوس نہ کرو۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ۭ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۭ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَاۤءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ۝ (المائدہ ۵:۶۵-۶۶) اگر (اس سرکشی کے بجائے) یہ اہل کتاب ایمان لے آتے اور خدا ترسی کی رَوش اختیار کرتے تو ہم ان کی برائیاں ان سے دُور کر دیتے اور ان کو نعمت بھری جنتوں میں پہنچاتے۔ کاش! انھوں نے تورات اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی تھیں۔ ایسا کرتے تو ان کے لیے اوپر سے رزق برستا اور نیچے سے اُبلتا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگ راست رَو بھی ہیں لیکن ان کی اکثریت سخت بدعمل ہے۔

گویا اسلام سے قبل بنی اسرائیل کو جب قیادت کی ذمہ داری دی گئی تو ان سے بھی یہی کہا گیا کہ وہ تورات کو پورا کا پورا جیسا اس کا حق ہے سمجھیں، نافذ اور قائم کریں اور اس میں اپنے مطلب کے اجزا الگ کر کے دین کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دیں۔ قرآن کریم نے نہ صرف تورات کے حوالے سے بلکہ دین حق کے حوالے سے بھی جگہ جگہ یہ بات واضح کر دی ہے کہ صحیح اور سیدھا دین اگر ہے تو صرف اسلام ہی ہے۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (یوسف ۱۲:۴۰) ''یہی ٹھیٹھ سیدھا طریقِ زندگی ہے''۔

اسی دین کی اقامت کے لیے اُمت مسلمہ کو خیر امتہ اور امت وسط قرار دیتے ہوئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے پر مامور کیا گیا ہے۔ یہ کام جہاں اجتماعیت، نظم وضبط اور تحریک کے بغیر عقلاً ممکن نہیں، وہاں اولین تحریک اسلامی کی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے جن تربیت یافتہ اصحاب کی ٹیم کو تیار کیا ان سب نے اجتماعی طور پر مدینہ منورہ میں وہ نظام قائم کیا جس نے عدل، توازن، عبودیت اور حاکمیتِ الٰہی کی قرآنی تعلیمات واحکام کو اور قرآنی حدود و تعزیرات کو عملاً قائم کر کے دین کے کامل اور قابلِ عمل ہونے کو قیامت تک کے لیے جیتی جاگتی مثال بنا دیا۔ سادہ الفاظ میں اقامتِ دین کا مفہوم اسلامی عبادات کے ساتھ دین کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام کا زمین پر نافذ کرنا ہے۔

اقامتِ دین کی حکمت

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اقامتِ دین کا مطلب پورے کے پورے دین کو قائم کرنا ہے جسے اس دور میں بظاہر 'بدنام' کرنے کے لیے مغرب میں 'سیاسی اسلام' کے نام سے پکارا جاتا ہے، تو یہ 'سیاسی اسلام' ان ممالک میں کیسے نافذ ہوگا جہاں لادینی جمہوریت یا سرمایہ دارانہ نظام رائج ہے؟ قرآن کریم میں اقامتِ دین کے لیے اُمت مسلمہ کو ذمہ داری دیتے وقت یہ بات بھی واضح کر دی گئی ہے کہ امت کی جواب دہی ہمیشہ بقدر استطاعت ہوگی۔ اگر مسلمان کسی اکثریتی ملک میں جہاں اہل ایمان کو یہ آزادی ہے کہ وہ نہ صرف اپنے گھریلو، معاشی، معاشرتی، ثقافتی معاملات بلکہ سیاسی معاملات میں ایسے افراد کو ذمہ داری پر مامور کریں جو اللہ تعالیٰ کے احکام کے پابند ہوں اور ان کے نفاذ کے لیے کوشاں ہوں، لیکن وہ لوگ ایسا نہ کریں تو اس دنیا میں اور آخرت میں بھی ان سے دین کی اقامت نہ کرنے پر احتساب نہ صرف عقل کا مطالبہ ہے بلکہ قرآن کے واضح احکام کی شکل میں پایا جاتا ہے۔

اگر مسلمان کسی ایسے ملک میں ہوں جہاں وہ 'مذہبی آزادی' کے اصول کی بنا پر دین کے ایک حصے پر عمل کر سکتے ہوں اور بغیر کسی روک ٹوک کے دین کی دعوت بھی پیش کر سکتے ہوں لیکن تبدیلیِ اقتدار ان کے اختیار میں نہ ہو، تو اقامتِ دین کے حوالے سے ان کی ذمہ داری اور آخرت میں جواب دہی اسی حد تک ہوگی جتنا انھیں عمل کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ لیکن اس تناظر میں

انھیں یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ مقامی صورت حال کے پیش نظر دین کی من مانی تعبیر کرتے ہوئے اس کے سیاسی ، معاشی اور قانونی تعلیمات کے منکر ہوکر دین کو صرف انفرادی زندگی تک محدود کرکے عیسائیت کی طرح ایک روحانی مذہب بنا دیں۔ یہ تو اللہ کے دین کے ساتھ مذاق اور عملی بغاوت ہوگی۔ البتہ دین کو اس کی جامعیت کے ساتھ تسلیم کرتے ہوئے حالات کی روشنی میں عمل کریں اور دعوت وتبلیغ کے ذریعے اپنی بساط بھر کوشش کرتے ہیں تو یہ صراطِ مستقیم سے قریب تر ہوگا۔ دین جیسا ہے ویسا ہی رہے گا___ ہاں، اس کے بعض مطالبات زمان ومکان کی قید کی بنا پر اس وقت تک نافذ نہیں ہوں گے جب تک ان کے نفاذ کی قوت ہاتھ میں نہ آجائے۔ اس معاملے میں قرآن کریم نے ’تکلیف‘ کے اصول کو بڑے واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے: لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ (البقرہ۲: ۲۳۳) ’’مگر کسی پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بار نہ ڈالنا چاہیے‘‘۔

یہ آیت ہمیں یہ اصول سمجھاتی ہے کہ انسان کس حد تک ذمہ دار اور جواب دہ ہے۔ اس کی جواب دہی بھی انھی معاملات میں ہے جن میں اسے اختیار ہے۔ اس لیے یہ ساری بحث کہ امریکا میں یا یورپ میں اقامتِ دین کیسے ہوگی؟ دین کے بنیادی حقائق کو صحیح طور پر نہ سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ دین بہت سادہ، عملی اور عقلی ہے۔ گویا اقامتِ دین سارے کے سارے دین کی تعلیمات کی دعوت اور نفاذ کا نام ہے لیکن اگر صورت حال ایسی ہو کہ بعض احکام پر مکمل عمل امکان اور اختیار سے باہر ہو تو جس حد تک عمل ہوسکتا ہے اس کا اہتمام وہی دین کا مطالبہ ہوگا۔ مثلاً ایک شخص طاقت ور مومن ہو لیکن اسے زنجیروں سے اس حد تک باندھ دیا جائے کہ وہ صرف رکوع کرسکتا ہو سجدہ نہ کرسکتا ہو تو کیا اس بنا پر وہ نماز ترک کردے گا یا رکوع کرنے کے بعد جس حد تک وہ جھک سکتا ہے، جھکے گا اور وہی اس کا سجدہ شمار کیا جائے گا اور اس طرح ادا کی گئی نماز اور ایک آزاد فرد کی نماز کی ادائیگی میں کوئی تفریق نہیں کی جائے گی کیوں کہ رب کریم کو علم ہے کہ اس کا بندہ مجبور ہے اور اسی حد تک جسم کو جھکا سکتا ہے جتنا قید وبند میں ممکن ہے۔

اقامتِ دین کے لیے تمام موجود ذرائع کا استعمال کرنا اور دین کی تعلیمات کو بغیر کسی کمی بیشی کے بہترین انداز میں پیش کرنا وہ اہم فریضہ ہے جس کے لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے امت مسلمہ کو پسند فرمایا ہے۔ امت مسلمہ کے لیے اس ذمہ داری پر مقرر کیا جانا ایک ایسا اعزاز ہے، جس کا

شکر ادا کرنا اس پر فرض ہے اور یہ شکر صرف اپنے تمام وسائل کو وہ مادی ہوں، عقلی اور ذہنی ہوں یا تنظیمی ہوں، حتی المقدور استعمال کر کے ہی ادا کیا جاسکتا ہے۔

بنی اسرائیل کو جب دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتاب شریعت کو قائم کرنے پر مامور کیا گیا اور انھوں نے اقامتِ دین کے فریضے کی ادایگی جیسا کہ اس کا حق ہے نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی جگہ امت مسلمہ کو اپنے فضل سے یہ ذمہ داری سونپ دی۔ قرآن کریم اپنے سے پہلے کے الہامی مذاہب کا حوالہ دیتے ہوئے کئی مقامات پر وضاحت سے بیان کرتا ہے کہ تمام انبیاے کرامؑ کے آنے کا مقصد صرف اور صرف اللہ کی زمین پر اللہ کے نظام کا قائم کرنا یا اقامتِ دین تھا۔ فرمایا گیا:

> وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ط (المائدہ ۵:۶۶) کاش! انھوں نے تورات اور انجیل اور ان دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی تھیں۔ ایسا کرتے تو ان کے لیے اوپر سے رزق برستا اور نیچے سے ابلتا۔

تورات اور انجیل کے قائم کرنے یا اقاموا کا واضح مطلب ان کتابوں کو طبع کر کے لوگوں میں تقسیم کر دینا یا ان کو خوش الحانی سے پڑھنا نہیں ہے، بلکہ ان احکامات کو نافذ کرنے کے لیے قوتِ نافذہ کا استعمال کرنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داوٗدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے حوالے سے اس قوت نافذہ کو واضح الفاظ میں اپنے کلام عزیز میں بیان فرما دیا:

> يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط (صٓ ۳۸:۲۶) اے داوٗدؑ ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے، لہٰذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور خواہشِ نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔

یہاں حضرت داوٗدؑ سے واضح طور پر جو بات کہی گئی ہے وہ نہ صرف انھیں خلافت پر مامور کرنا ہے، بلکہ قانونی معاملات میں بااختیار حاکم اور قاضی کی حیثیت سے حق پر مبنی فیصلے کرنے کے ذریعے اقامتِ دین کرنا ہے۔ اسی سورہ میں آگے چل کر حضرت سلیمانؑ کی وہ دعا بیان کی گئی ہے جس میں وہ اقامتِ دین کے لیے ایسی سلطنت کی خواہش کرتے ہیں جو بے مثال ہو:

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَ هَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ (صٓ ۳۸:۳۵) اے میرے رب، مجھے معاف کر دے اور مجھے وہ سلطنت (مُلْکًا) دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو، بے شک تو ہی اصل داتا ہے۔

قرآن کریم عیسائیت اور یہودیت کے اس ذہن کی تردید کرتا ہے جس میں قانون اور روحانیت کو دو خانوں میں تقسیم کرنے کے بعد قانون کو بادشاہت کے لیے اور روحانیت کو اہل اللہ کے لیے مخصوص کر دیا گیا اور یہی تصور صدیاں گزرنے پر نہ صرف یہود و نصاریٰ بلکہ خود مسلمانوں کے کچھ طبقات کے ذہنوں میں، خصوصاً سامراجی غلامی کے دور میں، جاگزیں کر دیا گیا، اور اس پر مزید ایک ظلم یہ کیا گیا کہ شریعت کے ایک بڑے حصے کو شریعت سے الگ کر کے خالص روحانیت کے نام سے تصورِ طریقت ٹھیرا کر مشہور کر دیا گیا۔ قرآن کریم جب اقامتِ دین کا حکم دیتا ہے تو وہ عبادت، تزکیہ، حب الٰہی، اطاعت رسولؐ، ادایگی حقوق اللہ وحقوق العباد، اجتماعی اصلاح، قیام عدل و احسان میں کوئی تقسیم نہیں کرتا بلکہ سب کے مجموعے کو دین القیم کا نام دیتا ہے:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَ ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ (البینۃ ۹۸:۵) اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے، بالکل یکسو ہو کر، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ یہی نہایت صحیح و درست دین ہے۔

اس مختصر آیت مبارکہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دین کے جامع تصور کو توحید اور اس کے دو مظاہر اقامت صلوٰۃ اور اقامت زکوٰۃ کے ساتھ مربوط اور واضح فرمایا ہے، یعنی یکسو ہو کر اللہ کی بندگی کا پہلا مرحلہ اقامت صلوٰۃ ہے جو اقامتِ دین کی اولین شکل ہے۔ گویا محض نماز کا پڑھنا نہیں کہ پانچ وقت نماز ادا کر لی گئی یا رات کی تنہائی میں اللہ کو یاد کر لیا، بلکہ اس نظامِ عدل کا قیام جس میں نماز فحشاء اور منکرات سے بچانے کا کام کرے۔ پانچ وقت اس بات کا اعلان و اعادہ کہ اللہ کی زمین پر اگر کسی کی حکومت ہے اور ہونی چاہیے تو وہ صرف مالک و خالق کائنات ہی کی ہو سکتی ہے۔ وہی اکبر ہے، وہی اعلیٰ ہے، وہی ہدایت دینے والا ہے، وہی فلاح کا ضامن ہے، وہی اپنے بندوں کی دعا کو سنتا اور قبول کرتا ہے اور حکم و اختیار صرف اور صرف اس کے لیے ہے۔

سورۂ حج میں اقامتِ دین کی اس ذمہ داری اور مشن کو اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ط وَ لِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ o (الحج ۲۲:۴۱) یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے۔ اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

اسی طرح ایک صاحب مال پر فرض کر دیا گیا کہ وہ معاشرے کے ضرورت مند افراد کو ان کا حق دے۔ زکوٰۃ کسی پر احسان کرنا نہیں ہے، بلکہ اپنے اوپر احسان کرنا ہے کہ ایک مستحق کا وہ حق جو صاحبِ مال کو بطور امانت دیا گیا تھا وہ اس نے اصل مالک کو پہنچا دیا۔ اس کے ساتھ یہ پیغام بھی دیا جارہا ہے کہ زکوٰۃ کے ذریعے ایک غریب شخص ایمان کی تکمیل اسی وقت کرسکتا ہے جب وہ زکوٰۃ میں حاصل کی ہوئی مدد کو اس طرح استعمال کرے کہ جلد از جلد خود زکوٰۃ دینے کے قابل بن سکے۔ اس طرح زکوٰۃ معاشرے میں معاشی خوش حالی اور خود انحصاری پیدا کرنے کے لیے ایک شرعی محرک بن کر صاحبِ مال اور غریب دونوں کو معاشی جدوجہد کی دعوت دیتی ہے۔ گویا اقامت زکوٰۃ کا مطلب نظام زکوٰۃ کا قائم کرنا ہے۔ یہ محض چند افراد کی مالی امداد کا نام نہیں، نہ یہ کسی قسم کا ٹیکس ہے جو امیروں پر لگایا گیا ہے۔ یہ ایک عبادت ہے۔ یہ فریضہ ہے، یہ شرعی محرک ہے تاکہ غربت دُور ہو اور معاشی استحکام پیدا ہو۔

نماز اور زکوٰۃ کا یہ نظام دین کی اقامت کے ساتھ وابستہ اور پیوستہ ہے۔ اسلامی ریاست کے فرائض و واجبات میں یہ بات شامل کر دی گئی کہ وہ نظام صلوٰۃ اور نظام زکوٰۃ کے لیے اپنی قوتِ نافذہ کو، حکومت کے وسائل و اختیارات کو استعمال کرے گی۔ چنانچہ سورۃ الحج میں صاف طور پر فرمایا گیا کہ اگر ہم تمھیں زمین میں اختیار دیں تو اقامت صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے نظام کا قیام تمھاری سرکاری ذمہ داری ہے (الحج ۲۲:۴۱)۔ دین کی یہ جامعیت ہی ہے جو اسے دنیا کے تمام مذاہب سے ممتاز کرتی ہے اور جس کو نہ سمجھنے کی بنا پر مسلمان اور غیرمسلم سادہ لوحی سے یہ کہنے لگتے ہیں کہ جس طرح دیگر مذاہب میں Charity کا تصور ہے ایسے ہی اسلام میں زکوٰۃ کی تعلیم ہے۔ زکوٰۃ نہ Charity ہے نہ کوئی ٹیکس اور ذاتی عمل، بلکہ یہ ایک معاشرتی فریضہ ہے جو اجتماعیت کا

لازمی حصہ ہے۔ قرآن نے اس انقلابی تصور کو بڑی خوب صورتی سے ان الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذاریات ۵۱:۱۹) ''اور ان کے مالوں میں حق تھا سائل اور محروم کے لیے''۔

اگر بنی اسرائیل اور نصاریٰ اس بات کو سمجھتے اور اقامتِ دین کرتے تو قرآن کریم کا فرمان ہے کہ ان پر آسمان اور زمین سے رزق کے دروازے کھل جاتے، آسمان سے رزق برستا اور زمین سے اُبلتا لیکن وہ اقامتِ دین کے فریضے سے فرار اور دین کو انفرادی اور ذاتی مذہبی عبادت سے تعبیر کر کے ایک بڑے انحراف میں پڑ گئے۔ آج اس انحراف کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ اس انحراف سے نکالنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیینؐ کے ذریعے دین القیم کو اس کی اصل اور درست شکل میں دوبارہ قائم کرنے کے لیے آپؐ کو رحمۃ للعالمینؐ بنا کر مبعوث فرمایا اور آپؐ کے بعد اس اقامتِ دین اور شہادت حق کی ذمہ داری کو آپ کی امت پر فرض کر دیا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَي النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط (البقرہ ۲:۱۴۳) اور اسی طرح تو ہم نے تمھیں ایک 'اُمّتِ وَسَط' بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

شُهَدَآءَ عَلَي النَّاسِ سے مراد محض اسلام کے بعض درخشاں پہلو اچھے انداز میں بیان کر دینا نہیں ہے، بلکہ اسلام کی ایک ایسی عملی مثال قائم کرنا ہے، جسے آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کے بعد ہر دیکھنے والا اسلام کی صداقت پر شہادت دینے پر آمادہ ہو جائے۔ شُهَدَآءَ عَلَي النَّاسِ بننے کا یہ کام صرف اللہ کی زمین پر اللہ کی ہدایت کے مطابق مکمل نظام عدل کے قیام سے ہی ممکن ہے۔

اقامتِ دین کا اسلوب

اقامتِ دین اور شہادت علی الناس کے فریضے کو قرآن کریم نے جگہ جگہ مختلف حوالوں سے سمجھانے کے لیے دعوتی اور تعلیمی اسلوب اختیار کیا ہے۔ سورۃ الحج میں اس اقامتِ دین کو چار اہم حکومتی فرائض کی شکل میں بیان فرمایا گیا۔ چنانچہ اہل ایمان کی تعریف (definition) یہ کی گئی کہ:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ط وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ (الحج ۲۲:۴۱) یہ وہ لوگ ہیں جنھیں

اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور بُرائی سے منع کریں گے۔ اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

لیکن اس سے ایک آیت قبل ان اہل ایمان کی اس ریاستی ذمہ داری کو بیان کرنے سے قبل جو بات کہی گئی تھی وہ غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ:

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ط وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِ ھِمْ لَقَدِیْرُ o نِ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِ ھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ط (الحج ۲۲: ۳۹-۴۰) اجازت دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے، کیوں کہ وہ مظلوم ہیں، اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے ہیں ہمارا ربّ اللہ (ہی) ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی بھی مشرکانہ اور دہریت پر مبنی نظام میں کچھ لوگ وہ چاہے کم تعداد میں ہوں یا زیادہ اگر چپکے چپکے اپنے گھر میں، اپنی مسجد میں، اپنے کلیسا یا مندر میں دن کے اوقات میں اور راتوں کی تاریکی اور تنہائی میں اپنے رب کو یاد کرتے تو اس طرح کے روحانی عمل سے اردگرد کے معاشرے میں کسی کو کیا پریشانی یا تکلیف پہنچ سکتی تھی؟ اگر مکہ مکرمہ میں مسلمان اپنے گھروں کے اندر بیٹھ کر اللہ کے نام کی تسبیح اور نمازیں ادا کرتے رہتے تو اس سے مشرکین کو کیوں پریشانی ہوتی؟ واضح بات ہے کہ مکہ میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے، اقامتِ دین کے معنی محض ادائیگی نماز کا نام نہ تھا بلکہ تمام جھوٹے خداؤں کی جگہ صرف اللہ وحدہ لاشریک کی حاکمیت کا قائم کرنا تھا۔ اگر معاملہ صرف اللہ جل جلالہ پر ایمان لانے کا ہوتا تو اہل مکہ بہ آسانی اپنے بہت سے خداؤں میں ایک اللہ کا اور اضافہ کرلیتے۔

بات بڑی واضح ہے۔ اللہ کو ماننے کا مطلب ہی یہ تھا کہ وہ سارے خدا جو نسل، رنگ، لسانی، قبائلی برتری، اشرافیہ کی منزلت، دولت کی پرستش، جنسی آزادی، شراب نوشی اور سودخوری کی اجازت دیتے تھے صرف اللہ کو رب مانتے ہی باطل ٹھیرتے اور مادہ پرست نظامِ معیشت، معاشرت، سیاست اور قانون اور ہر شعبۂ حیات سے بے شمار خداؤں کی بے دخلی کے بعد ہی توحید کا قیام ممکن تھا اور یہ بات اہل مکہ کو خوب اچھی طرح معلوم تھی۔ وہ توحید کا مطلب شاید ہم سے زیادہ صحیح سمجھتے تھے۔

اسی لیے وہ اس کے شدت سے مخالف تھے۔

دین کی اقامت کا مطلب واضح طور پر توحید کی اقامت تھا اور اسی بنا پر مشرکین کے لیے اہل ایمان کا وجود ناقابلِ برداشت تھا۔ یہ بات سمجھانے کے لیے سورۂ حج کی یہی آیت ایک اور اہم حقیقت سے پردہ اٹھاتی ہے کہ انسانی تاریخ میں ظالم اور شیطانی قوتوں کا ہدف ہمیشہ یہی رہا ہے کہ وہ دعوت توحید کی مخالفت کریں۔ اس لیے توحید کے ماننے والوں پر ہر دور میں ظلم کیا گیا اور انھیں ان کے گھروں سے بے دخل کیا گیا۔ اسی بنا پر ان کو جنگ کی اجازت اس لیے دی جارہی ہے کہ وہ نہ صرف اپنے دینی شعائر بلکہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کی مذہبی آزادی کا تحفظ بھی کرسکیں۔

مذاہب عالم کی تاریخ اور کتب مقدسہ میں کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جو اپنے ماننے والوں پر یہ فریضہ عائد کردے کہ نہ صرف اپنی مذہبی آزادی اور اپنے عبادت خانوں بلکہ دوسروں کے مقاماتِ عبادت کا بھی تحفظ کریں، تاکہ ان مذاہب کے ماننے والے اپنی عبادت گاہوں میں جاکر اپنے مذہب کے مطابق اپنی مذہبی رسوم ادا کرسکیں۔ قرآن کریم وہ واحد الہامی کتاب ہے جو یہ کہتی ہے کہ:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ (الحج ۲۲:۴۰) اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد اور مسجدیں، جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے، سب مسمار کرڈالی جائیں۔

یہاں جنگ کی اجازت کا واضح مفہوم یہی ہے کہ یہ اجازت اجتماعی طور پر جنگ کرنے کی ہے۔ انفرادی طور پر بغیر کسی سیاسی اقتدار کے جنگ کا تصور پوری انسانی تاریخ میں نہیں پایا جاتا۔ اقامتِ دین ناممکن ہوگی اگر اسے محض زبانی اور تحریری اشاعتِ تعلیمات اسلام سے تعبیر کیا جائے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس طرح اسلام کا قیام اور اسلام میں پورے کا پورا داخل ہونا ناممکن رہے گا جب تک قرآن کو قائم کرتے ہوئے اس کے قوانین کو حکومت کے ذریعے نافذ نہ کردیا جائے۔ یہ تمام پہلو قرآن کریم نے بغیر کسی ابہام کے واضح کردیے ہیں اور جو لوگ قانون اور دعوت کے درمیان لکیر کھینچتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قانون تو انگریز سامراج کا ہو اور مسجد میں عبادت اللہ کی ہو، قرآن اس تصور کو سخت الفاظ میں چیلنج کرتا ہے۔ تورات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سورۂ مائدہ

میں فرمایا کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (المائدہ ۵:۴۴) ''جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں''۔ اس بات کو اگلی آیت میں یوں کہا کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (المائدہ ۵:۴۵) ''اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں''۔

یہاں اقامت تورات اور اقامتِ دین اور اقامت قرآن کریم کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دوٹوک انداز میں واضح فرما دیا کہ جب تک سیاسی قوت اور قانونی قوت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے احکام کا نفاذ نہ کیا جائے دین کی مکمل اقامت نہیں ہوسکتی۔ یہاں یہ بات دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ جن مقامات اور حالات میں مسلمان سیاسی غلبہ حاصل نہیں کر پاتے وہاں ان کی جواب دہی صرف ان کے اختیار اور قدرت کی حد تک ہے لیکن اس کے باوجود وہ دین کو مختصر نہیں کر سکتے کہ ان تعلیمات کو نظر انداز کر دیں جو دین کا لازمی حصہ ہیں۔

اقامتِ دین کے تصور میں یہ بات فطری طور پر شامل ہے کہ نہ صرف عبادات اور معاملات بلکہ سیاسی اقتدار اور نفاذ قانون کے بغیر دین کے قیام کا عمل مکمل نہیں ہوسکتا۔ سورۂ یوسف نے اس پہلو کو نہایت واضح الفاظ میں ہمارے سامنے رکھا ہے۔ پہلے تو حضرت یوسفؑ اپنے جیل کے ساتھیوں سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا بہت سے خداؤں کی بندگی اچھی ہے یا ایک مالک اور اعلیٰ ترین رب کی؟ پھر آپ ان تک وہ حق پہنچاتے ہیں جس کے لیے آپ اور تمام انبیا کرامؑ بھیجے گئے:

> يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (یوسف ۱۲:۳۹-۴۰) اے زنداں کے ساتھیو، تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمھارے آباو اجداد نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سَند نازل نہیں کی۔ فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود

اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

قرآن کریم نے حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور حضرت یوسفؑ کے حوالے سے یہ بات وضاحت سے بیان فرمائی ہے کہ اقامتِ دین کے لیے نہ صرف ابلاغ کے ذریعے بلکہ ریاستی ذرائع کا استعمال دین کا تقاضا اور مطالبہ ہے۔ پس یہی وجہ ہے کہ دین زندگی کو دین، چرچ اور بادشاہت میں تقسیم کا روادار نہیں ہے۔ چنانچہ خاتم النبیینؐ کی شکل میں نبوت اور ریاست دونوں کو یک جا کرنے کے بعد ہی آپؐ کے اس مجموعی داعیانہ کردار کو اسوۂ حسنہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جہاں آپؐ کا ہر ہر قول و عمل ایک سنت ہے اور آپؐ کی دعوتی زندگی جو ۲۳ سالوں پر پھیلی ہوئی ہے اور جو مکی اور مدنی دونوں اَدوار کی اپنی پوری جامعیت کے ساتھ امین ہے اور جس کا نقطۂ عروج آپؐ کا حجِ وداع کا خطبہ ہے، آپ کی سنتِ کبریٰ ہے جس کا دوسرا عنوان اقامتِ دین ہے۔

سیرت پاکؐ کی پیروی اور آپؐ کے اسوہ کا قیام اسی وقت ممکن ہے جب آپؐ کے مکی اور مدنی دور دونوں پر یکساں عمل کیا جائے اور مکہ کی تیرہ سالہ آزمایش بھری زندگی کی تکمیل کے مدنی مراحل کو الگ نہ کیا جائے۔ اسوۂ حسنہ مکہ اور مدینہ دونوں کی یک جائی کا نام ہے۔

اسوۂ حسنہ کی پیروی نامکمل ہوگی اگر صرف چند اخلاقی اصول تو اختیار کر لیے جائیں اور آپؐ کے قانونی کردار اور ریاستی معاملات میں آپؐ کے رویے کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اقامتِ دین صرف اسی وقت صحیح طور پر ہوسکتی ہے جب یہ دونوں پہلو یک جا ہوں اور ان میں کوئی فاصلہ نہ پایا جائے۔

اقامتِ دین اور عصری رویے

ان قرآنی حقائق کی روشنی میں دو اہم عصری رویوں پر غور کرنا بھی ضروری ہے۔

● اول یہ کہ بعض اسلامی تحریکات سیاسی تبدیلی کو اس حد تک اولیت دیتی ہیں اور ان کے خیال میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد ہی اُوپر سے نیچے کی طرف تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے دستوری اور غیر دستوری جو ذرائع بھی ممکن ہوں ان کے استعمال کو بھی درست سمجھتی ہیں۔

● دوسرا رویہ یہ ہے کہ راستہ صرف ایک ہے، یعنی نچلی سطح سے اُوپر کی جانب پیش قدمی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اجتماعی اُمور کو متاثر کرنے اور ان کی صورت گری کی فکر کرنا بعد کی بات ہے۔

اصل اور ساری توجہ بنیادوں کو مضبوط کرنے میں صرف کرنی چاہیے جس کے لیے عوام الناس میں کام کیا جائے چاہے اقامتِ دین کی اس جدوجہد کے ذریعے انقلاب امامت و قیادت میں غیر معمولی طویل وقت لگے۔ اس رویے کے ماننے والے مکی دور دعوت اور ابنیاے کرام کے اسوہ کی روشنی میں یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اصل چیز عقیدے کی اصلاح اور تعمیر سیرت کی جدوجہد ہے۔ اگر اس دنیا میں کامیابی حاصل ہوجائے تو یہ اللہ کا فضل ہے، اگر یہاں کامیابی نہ بھی ہو تو آخرت کی کامیابی کا وعدہ ایک مسلمان کے لیے زندگی کا حاصل ہے۔ اس بنا پر جدوجہد کے طویل ہونے اور نتائج کے حدنظر تک نظر نہ آنے کی بنا پر مایوس ہونا اور اپنی دعوت اور اسوۂ انبیاؑ سے اخذ کردہ طریقِ دعوت پر شک کرنا ہماری بے صبری ظاہر کرتا ہے۔ ایک مومن کی اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے۔ یہاں پر کامیابی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا انعام و فضل ہے۔

● ان دو رویوں کا جائزہ لیتے وقت ایک ضمنی پہلو یہ بھی ابھرتا ہے کہ جن ممالک میں مسلمان اکثریت میں نہیں ہیں یا ایسی ریاستوں میں جہاں مغربی سیکولر جمہوریت قائم ہے وہاں اقامتِ دین کس طرح کی جائے گی؟ اس اہم سوال پر غور کرنے سے قبل اگر اس بات کا جائزہ لے لیا جائے کہ دعوت دین یا دعوت حق سے مراد کیا ہے؟ یہ کس قسم کی شہادت ہے جس کی دعوت قرآن کریم ہمیں دیتا ہے تو سوال کا اگلا حصہ زیادہ آسانی سے حل کیا جاسکتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ قرآن کریم کی انقلابی دعوت کا نقطۂ آغاز توحید ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان صرف اور صرف اپنے خالق حقیقی اور مالک کو اپنا رب مانتے ہوئے اپنے آپ کو مکمل طور پر اس کی اطاعت میں دے دے اور اس کام کو شعوری طور پر احساس ذمہ داری کے ساتھ کیا جائے۔ اسی لیے اس عمل کے لیے شہادت کا لفظ استعمال کیا گیا۔ شہادت قولی ہو یا عملی، ہر دو صورتوں میں انسان پورے احساس ذمہ داری، اختیار اور جواب دہی کے احساس کے ساتھ ہی شہادت دیتا ہے۔ ایک نابینا شخص کسی واقعے کی عینی شہادت نہیں دے سکتا لیکن کسی بات کی سماعت کی شہادت دے سکتا ہے۔ ایک شخص جو سننے کے لیے کسی آلے کا استعمال کرتا ہو سمعی شہادت بھی صرف اس وقت دے سکتا ہے جب یہ ثابت ہوجائے کہ وہ آلۂ سماعت پہنے ہوئے تھا۔ اس لیے قرآن کریم جب شہادت حق کی بات کرتا ہے تو اہل ایمان سے توقع رکھتا ہے کہ وہ اپنی زبان سے ہی نہیں بلکہ اپنے

طرزِعمل، طرزِفکر، اپنے معاشی، سیاسی، معاشرتی رویے سے توحید کی شہادت دیں گے۔ قرآن کریم جب کسی انسان کو ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے تو بات قولی اقرار تک نہیں رہتی فوراً اس اقرار کو ناپنے کا پیمانہ بھی پیش کر دیا جاتا ہے کہ صلوٰۃ قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ یہ دونوں عبادات اقامتِ دین کی اوّلین مظہر ہیں اور اسلامی معاشرت کی پہچان ہیں۔ مدینہ منورہ پہنچنے پر سب سے پہلا کام جو کیا گیا وہ مسجد کے قیام کے ساتھ مدینہ کے اقتدارِ اعلیٰ کا فیصلہ تھا۔ چنانچہ میثاقِ مدینہ قلم بند کیا گیا اور اس طرح اقامت صلوٰۃ اور اسلامی ریاست میں غیر مسلموں سے تعلقات کی نوعیت کا تعین نظامِ عدل کا قیام، معاشرے سے فواحش اور منکرات کے خاتمے کی بنیادیں رکھی گئیں۔ چنانچہ فرمایا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ؗ (المائدہ ۵:۸)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بنو۔

اسی بات کو زیادہ وضاحت سے یوں فرمایا گیا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَي النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ (البقرہ ۲:۱۴۳) اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک 'اُمّتِ وَسَط' بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

یہ اتنا اہم فریضہ ہے کہ اگر اسے ادا نہ کیا جائے یا اس سے رُوگردانی برتی جائے تو قرآن اس پر وعید کرتا ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۭ (البقرہ ۲:۱۴۰) اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوگا، جس کے ذمے اللہ کی طرف سے ایک گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے؟

چنانچہ جو شہادت حق کو چھپاتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر ذلت اور غلامی مسلط کر دیتا ہے:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۭ (البقرہ ۲:۶۱)

ذلّت وخواری اور پستی و بدحالی ان پر مسلط ہوگئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھِر گئے۔

اقامتِ دین ہی وہ واحد عمل ہے جو ذلت ومحکومی سے نجات دلاتا ہے۔ لیکن یہ کس طرح ہو؟ کیا محض اجتماعات میں تقاریر سے یہ کام ہوسکتا ہے، یا سال میں تین مرتبہ کسی مقام پر چند منتخب

افراد کا تین چار دن کے لیے یک جا ہو کر مطالعہ قرآن و حدیث اور نوافل کا اہتمام کرنا اس کے لیے کافی ہے، یا جب تک سیاسی اقتدار حاصل نہ کر لیا جائے؟ تزکیہ و تربیت کردار کو یکساں اہمیت دیتے ہوئے تبدیلیِ قیادت و نظام اور حصول اقتدار کی منظم جدوجہد کے ذریعے معاشرے کی تطہیر کی جدوجہد کا نام اقامتِ دین ہے۔ اقامتِ دین کا یہ قرآنی شعور ہر دور میں تحریکات اسلامی کے کارکنوں کے ذہن میں اٹھنے والے سوالات کا تسلی بخش جواب فراہم کرتا ہے۔ ایک سادہ مثال سے مزید وضاحت کی جاسکتی ہے۔ ایک ڈاکٹر کے پاس جب ایک مریض آتا ہے جس کی نبض کی رفتار درست نہ ہو، قلب بھی صحت مند نہ ہو، خون کا دباؤ بھی زیادہ ہو، سانس لینے میں بھی دقت پیش آرہی ہو، رات کو سو بھی نہیں سکتا، تو وہ اس کا مکمل جائزہ لینے کے بعد ہی یہ طے کرتا ہے کہ اصلاح کا آغاز کہاں سے کیا جائے۔ چنانچہ معائنے کی روشنی میں ہی وہ دوائیں تجویز کرتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی مقام پر مسلمان اقلیت میں ہوں اور وہ دین کی تمام تعلیمات کی اقامت نہ کرسکتے ہوں تو اقامتِ دین کا آغاز انھی اقدامات سے ہوگا جن کے کرنے پر وہ آزاد اور مختار ہوں۔ بقیہ تعلیمات کو جوں کا توں مانتے ہوئے مناسب وقت آنے پر ان کا نفاذ کیا جائے گا۔

اقامتِ دین کے مراحل

اقامتِ دین کا پہلا مرحلہ شعوری طور پر اسلام لانا اور تطہیر افکار یا توحید خالص کا ذہنوں میں جاگزیں کرنا ہے۔ یہ ایک طویل مرحلہ ہے۔ یہ دو چار برس کی بات نہیں۔ جب مکہ جیسی تربیت گاہ میں کسی اور کو نہیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے منتخب کردہ خاتم النبیینؐ کو ۱۳ سال جدوجہد کرنی پڑی تو ہم کیسے چار پانچ سال کی مہم میں متوقع نتائج حاصل کرسکتے ہیں (وما توفیقی الا باللہ)۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نتائج سے بے پروا ہو کر پوری قوت، حکمت اور منصوبہ بندی کے ساتھ اقامتِ دین کے پہلے نکتے پر توجہ دی جائے۔ اور تطہیر افکار وہ لوگ کریں جو خود نہ صرف تحریکی لٹریچر بلکہ قرآن و حدیث اور سیرت طیبہ سے براہ راست واقفیت رکھتے ہوں اور دعوت کو آسان اور مؤثر انداز سے پیش کرسکتے ہوں، نیز ان کی سیرت، دعوت کی دلیل پیش کرے:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (حم السجدہ ۴۱:۳۳) اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی، جس

نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔

تحریکاتِ اسلامی کے لیے اصل لمحۂ فکریہ تطہیر افکار اور فہم دین کے حوالے سے یہ جائزہ ہے کہ کیا ان کا ہر کارکن اپنی عملی زندگی اور معاملات سے اپنی دعوت پیش کر رہا ہے؟ یا وہ عوامی نعروں سے متاثر ہو کر تحریک میں تو آ گیا، لیکن اس کی اپنی زندگی ابھی تک اسی ڈگر پر ہے، جس پر دوسروں کو دیکھتا ہے؟ کیا اس کے معاملات وہ مالی نوعیت کے ہوں یا باہمی تعلقات سے متعلق ہوں، ان اصولوں کی پیروی کر رہے ہیں جن کی آسان تشریح ایک اہم تحریکی کتاب تحریک اسلامی میں کارکنوں کے باہمی تعلقات میں تحریک کے ایک خادم نے تحریر کر دی ہے، اور کیا اس نے اس تحریر کو شعوری طور پر مطالعہ کر کے جذب بھی کیا ہے؟

نتائج ہمیشہ اسباب کے تابع ہوتے ہیں۔ اگر ایک دیوار کی بنیاد کمزور ہو تو عمارت کتنی بلند کیوں نہ بن جائے وہ ناپایدار ہی ہوگی۔ تحریک اسلامی کی کامیابی محض سیاسی کامیابی اور نشستوں کی تعداد سے نہیں ناپی جاسکتی۔ اس کا اصل پیمانہ افراد کی اسلامی شخصیت ہے۔ ان کا خلوص اور دین سے عملی وابستگی ہے۔ اگر یہ ٹھوس بنیاد تعمیر ہوگئی تو نتائج چاہے صدیوں میں نکلیں تحریک ایک کامیاب تحریک ہے۔ نتائج کا نکالنا تحریک کا مسئلہ نہیں، نہ وہ ان کے لیے جواب دہ ہے۔ یہ مسئلہ اس کا ہے جو اس دنیا میں اصلاح، عدل اور اپنا نظام چاہتا ہے۔ صحیح کوشش، جدوجہد اور سعی اصل بنیاد ہے۔ کوشش اور جدوجہد ہی کا نام جہاد ہے۔ جتنی کامیابی بدر کی ہے، اتنی ہی کامیابی اُحد اور حنین کی بھی ہے۔ جو اجر بدری کو ملے گا وہی اجر احد اور حنین والے کو بھی ملے گا۔ اس لیے یہ سوال کہ اقامتِ دین کے لیے ہمیشہ اسمبلی نشستیں جیتنا کامیابی کا معیار ہے، قرآن وسنت سے مناسبت نہیں رکھتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ سیاسی جدوجہد کو نظرانداز کیا جائے یا سیاسی جدوجہد کے نتائج کو غیراہم سمجھا جائے۔ تاہم، تحریک کی کامیابی اور ناکامی کا اصل پیمانہ اور معیار محض اس کو نہیں بنایا جاسکتا۔

اقامتِ دین ایسے جامع طرزِعمل کا نام ہے جس میں زندگی کے تمام شعبوں میں انقلاب برپا کرنے کی کوشش اصل ہدف ہے۔ ظاہر ہے اس کا آغاز فکری انقلاب سے ہوگا، سیرت کے انقلاب سے ہوگا جو آخرکار معاشرت، معیشت اور قانون وسیاست پر جا کر مکمل ہوگا۔ اقامتِ دین کا آغاز تطہیرِ افکار اور تعمیرِ سیرت سے ہی ہوگا۔ جب یہ بنیادی مرحلہ شروع ہو جائے گا تو فطری طور پر

اصلاحِ معاشرہ کے ساتھ ساتھ اصلاح اقتدار کا مرحلہ بھی آئے گا۔ چوتھا مرحلہ اوّلین تین مراحل کے ساتھ فطری طور پر جڑا ہوا ہے، ان سے الگ اور آزاد نہیں ہے۔

زمینی حقائق کا اِدراک

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اقامتِ دین کے لیے تحریک کی حکمت عملی زمینی حقائق پر مبنی ہونی چاہیے۔ ہم کسی بھی معاشرے میں بس رہے ہوں اس کا آغاز جب تک گھر سے نہیں ہوگا ہم اپنا ہدف حاصل نہیں کرسکیں گے۔ ہمیں غیر اسلامی روایات اور رواج کو گھروں سے دور کرنا ہوگا تاکہ لوگ آنکھوں سے دیکھ لیں کہ اسلامی گھرانہ اور اسلامی معاشرت کیسی ہوتی ہے۔ ہمیں نہ صرف تربیت کے ذریعے صالح افراد پیدا کرنے ہوں گے بلکہ معاشرے میں بہت سے موجود صالح افراد کو تلاش کرکے اپنے سے قریب لانا ہوگا۔ ان کے خدشات کو دُور کرنا اور ان سے فاصلے کو کم کرنا ہوگا اور زمینی حقائق کے پیش نظر ترجیحات کا تعین کرنا ہوگا۔

ان صالح افراد کو بھی محض جمع کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ انھیں مزید عملی تربیت کے لیے معاشرتی کاموں میں مصروف کرنا ہوگا۔ شہروں اور دیہاتوں میں سڑکوں پر صفائی کی مہم، مساجد اور مدارس میں تعاون کی پیش کش، مساجد میں حکمت کے ساتھ حلقہ ہائے قرآن کا قیام، تعلیمِ بالغاں کے مراکز، مساجد کے قریب کسی مطالعہ گھر کا قیام جس میں قرآن و حدیث اور تحریکی لٹریچر نہ صرف کتابی شکل میں بلکہ سمعی مواد کی شکل میں بھی موجود ہو۔ بستی کے یتیم و معذور افراد کی خدمت کے لیے مستقل بندوبست، مزدوروں کے مسائل سے آگاہی اور ان میں نفوذ، اساتذہ اور پیشہ ور افراد، وکلا، تاجر برادری سے محض سیاسی مہم میں نہیں بلکہ ان سے دعوتی تعلق، ان کے مسائل میں آگے بڑھ کر ان کی رہنمائی اور حق کے لیے جدوجہد، اس اولین مرحلے کے لوازم ہیں۔

پورے ملک میں نجی شعبے میں تعلیم گاہوں کا ایک ایسے مربوط نظام کا قیام، جس میں وہ نصابی کتب شامل ہوں، جو کردار سازی کرتی ہیں اور طلبہ و طالبات کو ایسا ماحول میسر آئے، جس میں دین کے جامع تصور کو سمجھ سکیں۔

یہ کام کسی بہت لمبے عرصے کا مطالبہ نہیں کرتا۔ اس سارے کام کو حکمتِ عملی کے ساتھ کرنے میں اصل پیمانہ ہمہ تن کوشش، جذبۂ قربانی، اور اپنی تمام تر قوت کا اقامتِ دین کے لیے استعمال کرنا ہے۔

عزم الامور کے بعد نتائج کو اللہ پر توکل کرتے ہوئے اس پر چھوڑ دینا ہی قرآن کا طریقہ ہے۔

جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں ان کے لیے بھی اقامتِ دین کے ان مراحل میں کوئی تبدیلی کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ قرآن وسنت کی روشنی میں صرف اس کے لیے مکلف ہیں جو وہ کر سکتے ہیں۔ جس نظام میں وہ رہ رہے ہیں اس میں تبدیلیِ امامت کے لیے وہ مشروط طور پر مکلف ہیں، یعنی اگر مکمل بھلائی نہیں پیدا کر سکتے تو کم از کم تر برائی کے ذریعے ایک لمبے عمل کے ذریعے بھلائی کے لانے کے امکانات پیدا کر سکتے ہیں۔ ان سے سوال ان کے حالات کے مطابق اصلاح کی کوشش کے باب میں ہوگا، آخری ہدف کی میزان پر نہیں۔ بلاشبہہ ان سے یہ پوچھا جائے گا کہ جن معاملات میں ان پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی تھی، ان میں کیا کارنامہ کیا؟ کیا کسی نے ان کو اس سے روکا تھا کہ وہ اپنے گھر میں اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ اجتماعی مطالعہ قرآن وسیرت کریں؟ کیا کسی نے حکم دیا تھا کہ بچوں کو لازماً عریاں اور جنسی کارٹون دکھائیں؟ کیا کسی نے پابندی لگائی تھی کہ وہ اپنے اردگرد مسلم اور غیر مسلموں کو اپنے کردار سے متاثر کر کے دین سے متعارف کرائیں؟ کیا کسی نے یہ کہا تھا کہ وہ باہمی تعاون کے ایسے ادارے جو تجارتی کام غیر سودی شکل میں کریں قائم نہ کریں؟

اقامتِ دین کے مراحل واضح ہیں۔ ضرورت اپنے ذہن کو صاف کرنے کی ہے اور یہ بات سمجھنے کی ہے کہ تحریکاتِ اسلامی نے اقامتِ دین کے جو اَبدی اصول قرآن وسنت سے اخذ کیے ہیں وہ نہ وقتی ہیں نہ جغرافیائی کہ صرف پاکستان یا مصر یا سوڈان میں قابلِ عمل ہوں اور امریکا، کینیڈا اور آسٹریلیا میں ان پر عمل نہیں ہوسکتا۔ اصل مسئلہ اپنے ذہن کو مغرب کی مرعوبیت سے آزاد کر کے ان اصولوں پر عمل کر کے انھیں عملاً نافذ کرنے کا ہے۔ یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنا تعلق سب سے کاٹ کر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسولؐ سے ایک ایسے عہد کے ساتھ کریں جو صرف ان کے اور ان کے رب کے علم میں ہو۔